ڈاکٹر صائمہ نذیر

استاد شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

اسی(۸۰) کی دہائی کی غزل کا موضوعاتی مطالعہ

Dr. Saima Nazir

Assistant Professor, Department of Urdu NUML Islamabad.

Thematic Study of 80s' Ghazal

During 70s and 80s, Pakistani society underwent great social and political changes. The martial law imposed by Gen Zia ul Haq and the execution of the popular leader Zulfiqar Ali Bhutto caused great upheavals in the society. This chaos and unrest coupled with the duress of the martial law gave birth to resistance movement in Urdu literature, especially in Ghazal. The Ghazal of 80s seems shrouded with symbols to reflect resistance under the coercion of martial law. The poets of this era invented new symbols which hold a galaxy of new meanings and significance in Ghazal. In this paper, the researcher explores and discuss in details the trend of resistance in Ghazal of 80s and the new symbols employed by poets to demonstrate resistance.

Key words: *Society, Social, Political, Significance, Ghazla, Resistance, Symbols, Demonstrate*

.

۷۰ کی دہائی پاکستان کی تاریخ میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس دہائی میں نہ صرف جغرافیائی بلکہ سیاسی اور سماجی سطح پر بھی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مشرقی پاکستان کا الگ ہونا پاکستانی عوام کے لیے کسی قیامت عظمیٰ سے کم نہ تھا اور اس قیامت کے ساتھ ساتھ مارشل لا کے بار بار نافذ ہونے سے جبر اور بے یقینی کی عجیب فضا پیدا ہوئی۔ان حالات میں ملکی فضا میں مزاحمتی رویے نے جنم لیا۔مزاحمت کا یہ رویہ ایک دم سے پیدا نہیں ہوا۔پاکستان میں پے در پے لگنے والے مارشل لائوں نے اس رویے کی آبیاری کی۔

۱۹۷۱ء کے بعد پاکستانی عوام کو جمہوری حکومت ملی جس میں ۱۹۷۳ء کو پہلا باضابطہ آئین بنا۔اس جمہوری فضا میں شاعروں اور ادیبوں نے آزادیٔ اظہار کے نعرے بلند کیے لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور ملک میں پھرمارشل لا نافذ کر دیا گیا۔پاکستان کو جمہوریت کی فضا زیادہ عرصے تک راس نہ آ سکی۔ ملک میں اختلافات اور تخت و تاج کی ہوس کی آگ بھڑک اٹھی۔حکومت کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں اور قوم پہ پھر آزمائش کا وقت آ گیا اور ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ان حالات میں جمہوریت کے

نعرے بلند کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں اور انھیں ظلم و جبر کا نشانہ بنایا گیا۔اس مارشل لا کے دوران قوم لگا تار ذہنی کرب اور کشمکش میں مبتلا رہی اور خاک و خون کے انقلاب سے دو چار رہی۔اس دوران حکومتی سطح پر اسلام کے مظاہر کو فروغ دینا شروع کیا گیا اور یوں اسلام پسند عوام اور مذہبی طبقے کی حمایت حاصل کر کے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی راہ ڈھونڈ لی گئی۔اس کے باعث ایک مذہبی، سیاسی جبر کی فضا ہر جانب ایسی محیط ہوئی کہ جسم و روح میں ایک بے سمتی کا رجحان پیدا ہونے لگا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حراست کے بعد ملک میں احتجاجی تحریک شروع ہوئی جو بھٹو کی حراست کے خلاف احتجاج کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔بھٹو کا تعلق ایک بڑی سیاسی جماعت سے تھا، نہ صرف سندھ بلکہ پورے ملک میں ایک احتجاجی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جسے بڑی بے دردی سے ختم کر دیا گیا تھا۔لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں دی جانے لگیں۔ان حالات نے ملک میں ایک منفی رجحان کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ملک میں انتشار و افراتفری پیدا ہونے لگی۔ظلم و جبر کی کیفیت جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو اس کے خلاف ردعمل کا ظاہر ہونا ایک فطری کیفیت ہے۔اس ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند ہوئی تو ظلم میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے بعد ظلم و جبر کی جو جنگ پاکستان میں شروع ہوئی اس کے بعد لاقانونیت، فرقہ بندی، لوٹ مار اور دہشت گردی جیسے مسائل نے جنم لیا۔ظلم و جبریت کی اس کیفیت میں شاعر اور ادیب اس کے خلاف لکھنے پر مجبور ہو گئے اور اپنے مزاحمتی رویے کی عکاسی انھوں نے مزاحمتی ادب کو تخلیق کر کے کی۔پورے ملک میں انتشار اور بے چینی کی فضا طاری ہو گئی۔ڈاکٹر انور صابر لکھتے ہیں:

> ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک شروع ہوئی جس کے دوران میں سندھ میں خاص طور پر سیاسی محاذ آرائی نے شدت اختیار کر لی جس پر قابو پانے کے لیے حکومت نے طاقت کا جا بے جا استعمال کیا۔سندھ میں پیپلز پارٹی کا زور توڑنے اور کراچی میں جماعت اسلامی کی بالادستی ختم کرنے کے لیے علیحدگی پسند جئے سندھ کو محبِ وطن کی سند افتخار جاری کی گئی اور لسانی بنیاد پر مہاجر قومیت کی سرپرستی کے نتیجے میں مہاجر قومی موومنٹ وجود میں آئی۔مارشل لا کے زیرِ سایہ یہ سیاسی بساط بچھانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے ریفرنڈم ۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو کروایا۔(۱)

جنرل ضیاء الحق کے ریفرنڈم کے کامیاب ہونے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ پانچ سالوں کے لیے جنرل ضیاء الحق ملک کے صدر ہوں گے۔اس کامیاب ریفرنڈم کے بعد آئین میں آٹھویں ترمیم کرکے ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو جمہوریت بحال کر دی گئی اور محمد خان جونیجو کی وزارت قائم ہو گئی۔اس طرح ایک وردی پوش دور کا خاتمہ ہوا لیکن کہانی نہیں بدلی ملک میں برائے نام جمہوریت قائم کر دینے سے ملک فضا میں خوشگوار تبدیلی نہ آ

سکی۔ مارشل لا کی اس کڑی دھوپ کے بعد جمہوریت کو سایہ دار درخت تصور کیا جانے لگا لیکن ملکی منظرنامے پر اچھے اثرات مرتب نہ ہو سکے۔

سندھ میں سیاسی فوائد کے حصول کے لیے کراچی میں مہاجر اور غیر مہاجر کے درمیان تفریق پیدا کر دی گئی اور وقتی مصلحتوں کے تحت فسادات کا ایسا بیج بویا گیا کہ پورے معاشرے کو لاقانونیت، لوٹ مار، دہشت گردی، قتل و غارت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسری طرف روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا تو امریکی ایجنڈے کے تحت افغان جنگ کو افغان جہاد کا نام دے کر جہاد تنظیموں کی تشکیل اور جہادی کارروائیوں کی سرکاری سطح پر حوصلہ افزائی شروع ہو گئی۔ امریکی امداد سے لڑے جانے والے اس جہاد نے پاکستان کو افغان مہاجرین کے جم غفیر کے ساتھ ساتھ منشیات اور اسلحہ کا کلچر بھی عطا کیا۔ ملک میں بدامنی میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف امریکی ڈالروں کے بھروسے پر معاشی منصوبہ بندی کے فقدان کے باعث افغان جنگ کے اختتام اور امریکی امداد کے رک جانے کے بعد ملک کی معاشی حالت بگڑنے لگی جس کے نتیجے میں لوٹ مار اور تخریب کاری بڑھنے لگی۔

ملک میں پھیلی بدامنی نے کراچی کو خاص طور پر متاثر کیا۔ برسوں سے ایک ساتھ رہنے والوں کے درمیان اردو، سندھی تنازعے نے نفرت کا ایسا بیج بویا جس کی فصل آج تک کاٹی جا رہی ہے۔ ہجرت کرنے اور نہ کرنے والوں کے درمیان نفرت کی ایسی دیوار کھڑی کر دی گئی کہ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ قتل ہونے والے اور قتل کرنے والے بھی مسلمان تھے۔ دونوں ایک ہی ملک پاکستان کے رہنے والے تھے۔ جس ملک کو حاصل کرنے کا خواب ایک ساتھ دیکھا گیا تھا تو اب یہ نفرت کیسی کہ ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں۔ اپنے ہی بھائیوں کو قتل کر کے خوش ہونا اور کامیابی کا احساس ہونا یہ سب کیا ہے؟ افغان جہاد کے تحت بہت سے افغان پاکستان میں آ کر آباد ہونے لگے۔ ان کے آنے سے پاکستان کی معیشت پر بہت بوجھ پڑا۔ افغان اپنے ساتھ اپنا کلچر بھی لے کر آئے۔ منشیات اور اسلحہ پاکستان میں عام ہونے لگا گویا ۸۰ کی دہائی بھی پاکستان کی تاریخ میں کوئی خوشگوار اضافہ نہ کر سکی۔ آمریت کے اس دور کا خاتمہ آخر کار ایک طیارے کے حادثے سے ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں ملک میں انتخابات کروائے گئے جن کے نتیجے میں ملک میں باقاعدہ جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

۸۰ کی دہائی کا آغاز گو خوشگوار نہ ہوا لیکن اختتام پر جمہوری حکومت کے قائم ہونے سے عوام میں پھر سے ایک امید بیدار ہوئی۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں صورت حال کچھ تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے وہ عوام جو سیاست دانوں کے جھوٹے وعدوں، خوابوں اور سرابوں میں گم تھی اب سچے اور جھوٹے میں کسی حد تک تمیز کرنے کے قابل ہو گئی۔ میڈیا کی ترقی نے بھی اس میں اہم کردار ادا کیا اور انسان کی سوچوں کو

وسعت عطا کی۔اب اس دور کا فرد صرف ذاتی مسائل پر ہی نظر نہیں رکھتا بلکہ دنیا سے بھی اپنا رشتہ قائم کرتا ہے۔

میڈیا کی ترقی سے انسان کی سوچوں کو جو وسعت ملی ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔یہ ۸۰ کی دہائی میں ہونے والی مثبت تبدیلی ہے لیکن ان مسائل سے نظریں چرانا بھی ممکن نہیں جو اس دہائی میں پاکستان کا مقدر بنے۔مارشل لاء کی جبریت نے مزاحمت کے شدید رویے کو جنم دیا اور مزاحمت کے خلاف ظلم نے زور پکڑا۔قتل و غارت گری عام ہو گئی۔ آزادیٔ اظہار پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ایک ہی ملک میں بسنے والے ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو گئے۔ایک مذہب کے پیروکاروں نے اپنے لیے الگ ملک حاصل کیا تھا۔اب وہ محض زبان کے مسئلے پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔اس کے علاوہ افغانستان کے باشندوں کے پاکستان میں آنے سے مسائل میں مزید اضافہ ہوا۔ملکی معیشت پر بوجھ پڑا جس کی وجہ سے مہنگائی اور پھر بے روزگاری جیسے مسائل بھی سامنے آنے لگے۔ ملک کے قابل نوجوان ہاتھوں میں ڈگریاں لیے محنت مزدوری کرنے پر مجبور تھے۔ان کو ان کی قابلیت کے مطابق ملازمتیں میسر نہیں تھیں۔اس وجہ سے نوجوان بھی غلط قسم کے کاموں میں ملوث ہو کر اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے لگے۔لوٹ مار، لاقانونیت، دہشت گردی، مہنگائی جیسی برائیاں اور مسائل پاکستان میں تیزی سے بڑھنے لگے۔ان حالات میں پاکستان کے ہر فرد پر گہری مایوسی اور خوف کے سائے طاری ہو گئے۔ہر وقت کی بے چینی اور کچھ ہو جانے کے خوف نے زندگی کی رمق ختم کر دی۔ان حالات میں جمہوریت کو امید کی کرن تصور کیا گیا اور ۱۹۸۸ء میں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔یہ پاکستان کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔پاکستان کی سیاسی فضا میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہوا۔یہ وہ حالات تھے جنھوں نے پاکستان میں لکھے گئے ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔اس عہد کے ادبی تقاضوں کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> عہدِ حاضر کے اپنے شدید اور فوری تقاضے ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ تقاضے خود انسانیت کی فنا و بقا اور خود اپنے ملک کی سا لمیت و فلاح سے گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔۔۔امنِ عالم کا مسئلہ، سائنس کی افادیت اور اس کی ہولناکیوں کا مسئلہ، اخلاقی قدروں کے تصادم اور تضاد کا مسئلہ، خاندانی اکائی کے ٹوٹنے کا مسئلہ، وسائل کی کمی کا مسئلہ، استبدادیت کا مسئلہ وغیرہ۔ہمارا اپنا ملک بھی ان مسائل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔اگر ایک طرف ہماری آزادی کو خطرہ ہے تو دوسری طرف قومی تشخص، یک جہتی اور نظریاتی جہت کے فوری مسائل ہیں۔انھیں کے ساتھ جاگیردارانہ نظام کی استبدادیت اور قبائلی نظام سے پیدا ہونے والی صدیوں پرانی ناہمواریت کے مسائل ہیں۔معاشی و مادی سطح پر معاشرے کی تشکیلِ نو کا مسئلہ ہے۔

> یہ کہنا غلط ہو گا کہ یہ ادیب کے مسائل نہیں ہیں یا یہ کہ عصری آگہی کے اس رخ کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ادیب تو زیادہ حساس ہونے کی وجہ سے ان مسائل کو عام شہری کے مقابلے میں زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔[۲]

یہ دہائی پاکستان کی تاریخ میں بہت سے انقلابات لے کر آئی اور ان انقلابات کے نتیجے میں ادب میں جو رجحان غالب نظر آتا ہے وہ مزاحمت کا ہے۔۸۰ کی دہائی کے ادب کا جائزہ لیں تو مزاحمت کا پہلو سب سے نمایاں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مارشل لاء کے نافذ ہونے سے ظلم و جبر کی جو فضا معاشرے میں طاری تھی اس کے خلاف مزاحمت کے رویے نے جنم لیا گو اس کا آغاز ۷۰ کی دہائی میں ہو چکا تھا لیکن اس رجحان کے تحت ۸۰ کی دہائی میں زیادہ لکھا گیا اور مزاحمت کا یہ رویہ کھل کر سامنے آیا۔ڈاکٹر روبینہ شہناز لکھتی ہیں:

> ہمارے ہاں مزاحمتی ادب کی اصطلاح فوجی حکومتوں کے ادوار میں استعمال ہوئی یہ لفظ زیادہ تر ۱۹۷۷ء کے مارشل لا کے دوران استعمال ہوا۔اگرچہ مزاحمتی اجتماعی اور مدافعتی ادب ہر عہد میں لکھا گیا۔[۳]

مزاحمت کا رویہ ہر عہد میں کسی نہ کسی سطح پر ضرور موجود رہا کیونکہ ہر دور میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو حالات سے مطمئن نہیں ہوتے اور ان کے خلاف لکھنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی ناآسودہ خواہشات کی تسکین ہوتی ہے۔اردو ادب کے حوالے سے یہ اصطلاح ۱۹۷۷ء کے مارشل لا سے اس لیے منسوب کی جاتی ہے کہ پاکستان میں لگنے والے دوسرے مارشل لائوں سے یہ مارشل لا مختلف تھا اس مارشل لاء میں جبر کی نوعیت مختلف تھی۔اردو ادب میں بھی مزاحمت کا رویہ آہستہ آہستہ سر اٹھا رہا تھا لیکن ۸۰ کی دہائی میں پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۷۷ء کے مارشل لا سے ملک میں خوف و دہشت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ پوری قوم نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو کر رہ گئی اور اس کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں دی جانے لگیں۔صحافیوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا ان حالات نے شعر و ادب کو بہت متاثر کیا۔ادب میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آئی کہ نئی علامات کا استعمال کیا جانے لگا۔خواہ افسانہ ہو یا شاعری نئی علامات کی آڑ میں اپنا مقصد بیان کیا جانے لگا۔اس کی وجہ یہی تھی کہ آزادئ اظہار سلب کر لی گئی تھی۔ان علامتوں میں قاتل، قتل، مقتول، حسین، یزید، کربلا، دارورسن، کوفہ، نیزے پر سر وغیرہ شامل ہیں۔علامت کسی بھی دور کے حالات و واقعات کی عکاس ہوتی ہے۔علامت کا استعمال ادب میں اس سے پہلے بھی ہوا لیکن اس دہائی میں جو علامت استعمال کی گئیں وہ قدرے واضح ہیں ان علامات سے اس دور کے حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔علامت کا استعمال ادب میں ردعمل کے طور پر ہوتا ہے۔شاعر اور ادیب جب گردو نواح کے حالات سے مطمئن نہیں ہوتے تو

علامت کا سہارا لیتے ہیں۔اس دور کی غزل میں علامت کے استعمال کے حوالے سے ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> نئے شعرا نے غزل میں جو علامت گری کی وہ ایک وقتی ردعمل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس طرح کی علامتوں میں نہ رمزیت ہوتی ہے اور نہ تہہ داری اسی لیے بہت جلد اس رجحان کا زور کم ہو گیا ردعمل کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔اس لیے اس ردعمل کی گرد بھی جلد ہی بیٹھ گئی۔(۴)

لیکن یہ بات پورے طور پر درست نہیں۔بعد میں آنے والی دہائیوں کی غزل کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دور میں جن علامتوں کو موضوعات کے اشاروں کے طور پر استعمال کیا گیا ان میں سے کئی علامتیں آگے چل کر اردو غزل کی روایت کا حصہ بن گئیں۔علامت نگاری ایک ایسا اسلوب ہے جس میں وہ باتیں بھی آسانی سے کہی جا سکتی ہیں جو وضاحتی انداز میں کہنے سے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔۔شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> علائم نگاری ایک ایسا اسلوب ہے جس میں بعض ایسی باتیں کہی جا سکتی ہیں جنھیں بیانیہ یا وضاحتی انداز میں کہنا آسان نہیں علامتی اسلوب میں سیاسی جبر کے بارے میں اظہار کے زبر دست امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں اس کا اندازہ ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور آمریت میں اس وقت ہوا جب علامت نگاروں نے سیاسی گھٹن اور بے چینی، مذہبی و دقیانوسیت، ظلمت پسندی اور جبریت کے خلاف مزاحمتی ادب تخلیق کیا۔(۵)

مزاحمت کا رویہ اردو شاعری میں بھی کافی مضبوط اور توانا دکھائی دیتا ہے۔اس زمانے کے بیشتر مجموعوں میں اسی موضوع کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس عہد میں چھپنے والا شعری مجموعہ ”خوشبو کی شہادت“ ہے۔اس مجموعے میں بھٹو کی پھانسی کے خلاف اور ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کی آواز بلند کی گئی ہے۔بھٹو کی پھانسی کے بعد مزاحمتی رویے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے وہ باتیں جو علامت کے پردے میں کہی جاتی تھیں اب کھل کر انھیں واضح انداز میں کیا جانے لگا۔شاعری میں بھی واضح تبدیلی دیکھنے کو ملی۔اس دور کے شاعر بھی قومی طرز احساس، آمریت اور جبر کے خلاف شدید غصے اور نفرت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔اور انھوں نے ملکی سلامتی، آزادیٔ اظہار تحفظ، عدم تشدد اور غیر استحصالی معاشرے کا خواب دیکھا اور اس خواب کو مزاحمتی ادب تخلیق کر کے عوام کی آنکھوں میں بھی بسایا۔قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۷۷ء کے مارشل لا اور پھر ۱۹۸۸ء میں اسمبلیوں کی برطرفی تک آمریت کا جو کھیل کھیلا گیا اسے پاکستانی عوام کسی طور بھول نہیں سکتی۔تشدد اور ظلم و جبر کی فضا میں سانس لیتا شاعر اور ادیب اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بے اطمینانی، خوابوں کی شکست و ریخت اسی زوال سے وابستہ ہیں جو ان کا مقدر بنا دیا گیا۔

معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں براہ راست انسانی زندگی اور طرزِ زندگی پر اثر ڈالتی ہیں۔اپنی زمین اور علاقے سے محبت کا جذبہ فطری جذبہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتا ہے۔عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے ان کے درمیان امتیازات کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں جس نے فسادات کو عام کر دیا۔افغانستان پر روس کے حملے سے بھی پاکستان براہ راست متاثر ہوا۔افغانستان کے باشندے پاکستان آ کر آباد ہونے لگے۔اس سے معیشت پر بوجھ پڑا جس کے نتیجے میں تخریب کاری، دھوکہ دہی، دہشت گردی، لوٹ مار عام ہو گئی کراچی ان میں سرفہرست رہا۔اس کے علاوہ افغان قوم اپنے ساتھ اپنا کلچر بھی لے کر آئی جس کی وجہ سے پاکستان میں منشیات جیسی لعنت عام ہو گئی۔اس کے علاوہ اسلحے کا کلچر بھی افغانستان کی دین ہے جس نے پاکستان کو بہت نقصان پہنچا۔ان مسائل کو بھی ادب کا حصہ بنایا گیا۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

> ۱۹۸۰ء میں افغانستان پر روس کے حملے سے چونکہ پاکستان براہِ راست متاثر ہوا تھا لہٰذا ہمارے اہلِ قلم نے افغانستان کے مسئلے پر بھی اظہارِ خیال کیا اور اس حوالے سے کئی مجموعے شائع ہوئے۔(۶)

کراچی کے حالات بہت عرصے تک خراب رہے یہ حالات ٹھیک ہوئے بھی تو وہاں کے باسیوں کے دلوں میں موجود انجانے خوف کو ختم نہ کر سکے۔شخصی اور گروہی مفاد کے تحت عام لوگ ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے کراچی میں برسوں بہن بھائیوں کی طرح رہنے والوں کے درمیان زبان کا مسئلہ پیدا کر دیا گیا۔اپنے ہی ملک کے باسیوں کو ان کے اپنے ہم وطن قتل کرنے لگے اور اخباروں اور خبروں کی زینت بننے لگے۔ان حالات نے ادب کو بھی متاثر کیا۔کراچی کی اس بے سکونی اور عدم تحفظ کو شعرا نے بھی اپنا موضوع بنایا اس کے علاوہ ان حالات نے جو اثرات مرتب کیے ان سے نئے موضوعات شاعری کا حصہ بنے۔کراچی کے ان حالات نے ہر طرف خوف اور بے چینی پیدا کر دی ہر فرد ایک ایسے خوف میں مبتلا ہے جس سے وہ چاہ کر بھی چھٹکارا نہیں پا سکتا ان تمام کیفیات کا اظہار غزل میں ملتا ہے۔اردو غزل ۸۰ کی دہائی میں انقلابی موضوعات لے کر سامنے آئی۔مارشل لا کے اثرات، بھٹو کی پھانسی، سیاسی لوٹ مار، اور ان سب سے بڑھ کر کراچی کے حالات کی عکاسی غزل میں بھرپور انداز میں کی گئی۔

> اردو غزل میں عصری کرب، بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی، سرمایہ دارانہ و سامراجی نظام، آمریت کے خلاف احتجاج اور خوشگوار مستقبل کے لیے دیکھے گئے خواب غرض ہر زاویۂ فکر کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔خلیق انجم رقم طراز ہیں کہ "ہماری پچھلی تین چار سو سال کی تہذیبی زندگی کے ارتقا کے واضح ترین نقوش اردو غزل میں موجود ہیں۔"(۸)

پاکستانی عوام پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے لے کر اب تک ایک جدوجہد کی کیفیت میں نظر آتی ہے۔ کہیں ہجرت کرنے والوں کو بسانے کی جدوجہد ہے کہیں ملک کو دشمن سے بچانے کی جدوجہد ہے تو کہیں ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد۔ پاکستانی عوام کی قسمت میں لکھی گئی یہ جدوجہد اسے مسائل سے لڑنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں سیاسی اور معاشرتی جبر کی کیفیت بہت لمبے عرصے تک قائم رہی۔ جہاں کچھ افراد نے اسے اپنی تقدیر اور مقدر سمجھ لیا وہیں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری سمجھا۔ اس لیے پاکستانی ادب میں مزاحمتی ادب کے عناصر ہمیشہ شامل رہے ہیں۔ شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> پاکستان میں صحیح معنوں میں مزاحمتی ادب کا آغاز یوں تو ضیا دور میں ہوتا ہے لیکن اس سے قبل خصوصاً ایوب خان کے دور سے لے کر یحییٰ خان کے مارشل لا تک کے عرصے میں جو ادب تخلیق ہوا اسے بھی بہت حد تک مزاحمتی ادب کہا جا سکتا ہے۔ خواہ اس دور میں یہ اصطلاح وضع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔[۸]

۸۰ کی دہائی کی غزل کا جائزہ لیں تو اس پر ناامیدی اور مایوسی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سقوط ڈھاکہ جیسے تاریخی واقعے نے شعرا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ابھی ملک کے دو ٹکڑوں میں بٹ جانے کی اذیت میں ہی مبتلا تھے کہ مارشل لا اور اس کے بعد پھیلی ظلمت اور قتل و غارت گری نے ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کیا۔ ۸۰ کی دہائی میں غزل کا سب سے اہم موضوع سیاسی بے چینی اور انتشار کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ گو یہ موضوع اس دہائی کی غزل کے لیے نیا نہیں ہے اس سے پہلے بھی غزل میں ظلم سے اور ظالم سے نفرت کی آواز بلند کی جاتی رہی ہے لیکن اس دہائی میں بھی جو غزل لکھی گئی اس ظلم و جبر کے خلاف کھل کر ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔ منیر نیازی لکھتے ہیں:

> ایک اور نمایاں رجحان ہماری غزل میں آ چکا ہے۔ سیاست تصوف کی جگہ لیتی جا رہی ہے نئی غزل بظاہر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اخلاقیات سے رشتہ توڑ کر اس نئے اخلاقی پروگرام کو اپنا رہی ہے جو سیاست کے تحت آہستہ آہستہ سامنے آ رہا ہے غزل میں سیاسی اخلاقیات کی آمد کوئی نئی چیز نہیں ہے ہمارے قدمانے ظلم سے نفرت دلانے اور ظالم کو عبرت کا سبق سکھانے کے ہزاروں شعر کہے ہیں اسی نوع کی کوشش ہماری جدید غزلوں میں نظر آتی ہے البتہ اس کوشش پر عہدِ نو کے اندازِ فکر کی چھاپ موجود ہے۔[۹]

۸۰ کی دہائی میں ظالم اور ظلم کے خلاف آواز بلند ہونے سے مزاحمت اور احتجاج کو تقویت ملی اور غزل میں خاص طور پر سیاسی نظام کے خلاف اور جبر و تشدد کے خلاف اظہار خیال ملتا ہے۔

اس مزاحمت اور احتجاج کے کئی پہلو ہیں۔ایک پہلو جو سب سے توانا ہے، یہ ہے کہ فرد پیکار پر اترتا ہے۔اسے یہ نظام قبول نہیں اور وہ اس کو بدلنے کے لیے بلند آواز اٹھاتا ہے۔پیکار کا یہ رویہ کئی غزل گوئوں کے ہاں آیا ہے۔اس میں تیقن اور اعتماد ہے اور للکار کا احساس ہوتا ہے۔یہ دراصل کچلے اور پسے ہوئے عوام کے شعور کا وہ حصہ تھا جسے جبر کی پے در پے آندھیاں بھی مٹا نہ پائیں۔یہ وہ طاقت تھی جس نے پاکستان جیسے نظریاتی وطن کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔عوام کے شعور کی یہ طاقت زخم خوردہ ضرور تھی مگر ہار مانی ہوئی نہ تھی۔اس میں جوش، ولولہ اور استحکام ابھی باقی تھا۔اس لیے یہ طاقت پورے زور کے ساتھ جبر کی قوت کو للکارتی اور پکارتی ہے۔اور واقعہ یہ ہے کہ اسی طاقت کے بل بوتے پر قوم کا مجروح تشخص اور کٹا پھٹا پندار کسی حد تک قائم رہا اور بعد میں جب حالات بدلے تو اسی طاقت کے بل بوتے پر عوام نے دوبارہ اپنے آپ کو سمیٹا اور نئی منزلوں کے خواب ازسرِنو دیکھے۔اس دور کی غزل میں للکار اور پیکار کے اس جذبے کی مثالیں دیکھیے:

ابھی تو آغازِ جنگ ہے اور تمھیں خبر کیا
میں فتح کی سمت کن بہانوں سے آ رہا ہوں
میں جانتا ہوں ، مِرا ہدف کون ہے یہاں پر
مجھے خبر ہے ، میں کن کمانوں سے آ رہا ہوں
(قمر رضا شہزاد)

مفاہمت نہ سکھا دشمنوں سے اے سالار
تری طرف نہ کہیں موڑ دوں کمان کو میں
(اختر عثمان)

مزاحمت کے خلاف ایک اور رویہ فرار ہے۔یہ ایسی صورت ہے جب کوئی جائے اماں نہیں، کہیں پناہ نہیں۔زمین و آسمان کی وسعتیں موجود ہونے کے باوجود گھٹن اور خوف کا احساس حاوی ہے۔اس سے بچنے کے راستے نظر نہیں آتے اور دل میں فرار کی تمنا پروان چڑھتی ہے۔ان کیفیات کا اظہار شعرا نے بڑے مختلف پہلوئوں سے کیا ہے۔اس میں تقدیر کے ستم اور حالات کے جبر کے روایتی مضامین کی جھلک بھی موجود ہے اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جبر کی نئی صورتوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

جائیں کہاں قفس سے اسیرانِ نیم جاں
واقف نہیں ہیں اب تو کسی آشیاں سے ہم
(ابراہیم خلیل)

خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں

(اختر امان)

پاکستانی معاشرے کے سماجی اور فکری مسائل کا حل مارشل لاء کی صورت میں ڈھونڈا گیاجو ابتر صورتِ حال کو سنبھالنے کے بجائے فکری اور سیاسی خلا کا باعث بنا۔ ہر شعبے میں بے سمتی کا احساس پیدا ہو گیا۔ معاشرہ بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ ۸۰ کی دہائی میں بھی جو غزل سامنے آئی اس کا مزاحمتی رنگ ہماری شاعری میں موجود مزاحمتی رویے کی توسیع بھی ہے اور اس حوالے سے سنگِ میل بھی۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> ہماری شاعری خصوصاً غزل کو جبر و تشدد اور سیاسی خوف کی فضا اور اس کے خلاف ایمائیت و اشاریت میں مزاحمتی رویے کا اظہار ورثے میں ملے ہیں۔ اردو غزل نے زوال میں آنکھ کھولی ہے اور شاعروں نے خزاں کے ہاتھوں باغ کی بربادی اور گلچین و صیاد کے حوالوں سے استعاراتی زبان میں اس زوال کی عمدہ عکاسی کی ہے اور دل اور دلی کے دکھ اور المیہ کو ایک دوسرے سے اس طرح ملا دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی غزل پر زوال کے یہ اثرات بہت واضح ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک استعاراتی مزاحمتی رویہ بھی پوری طرح موجود ہے۔[۱۰]

افسوس تو اس کا ہے کہ اس شہر کی چپ کو
کچھ بھی نہ ملا چرب زبانی کے علاوہ

(عباس تابش)

قافلے کو راستے میں کوئی خطرہ ہے ضرور
سب سے پیچھے رہنما رہنے لگا ہے ان دنوں

(خاقان خاور)

ذلتوں میں یہ ڈوبا ہوا کون ہے
یہ جو اوڑھے ہوئے ہے قبا کون ہے
کیا پتہ ان صداؤں کے گرداب میں
کس کی آواز میں بولتا کون ہے

(عطاء الحق قاسمی)

میرے بارے میں مرے سب فیصلے اس نے کیے
اور مجھے ان فیصلوں سے بے خبر رکھا گیا

(جواز جعفری)

بصارت کی طلب اور بے بصر سے
یہ کارِ معتبر ، نامعتبر سے

(خورشید بیگ میلسوی)

سالارِ کارواں نے سرِ ساحلِ مراد
کاغذ کی کشتیوں کو بھی شعلوں میں رکھ دیا

(ریاض حسین چودھری)

معاشی اور سیاسی ابتری نے جس بے سمتی کو جنم دیا تھا اس نے سوچوں کو بدل دیا۔اجتماعی تشخص کے بجائے ذاتی تشخص کو اہمیت دی جانے لگی۔اس معاشرے کے فرد نے اب صرف اپنی ذات کے حوالے سے سوچنا شروع کر دیا۔بقول خلیل الرحمن اعظمی:

> جدید تر شاعروں کی ایک نسل ایسی پیدا ہو چلی ہے جو انکار و اثبات کے دوراہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہی ہے۔یہ نسل جو نہ کافر ہے نہ مومن- زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر آن بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے، وہ انسان اور فطرت، جماعت اور فرد، محبت اور نفرت، ظاہر اور باطن، غم اور مسرت، زندگی اور موت، کفر و ایماں کے ناگزیر لیکن بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھ کر زندگی کے آہنگ کو دریافت کرنا چاہتی ہے۔[۱۱]

فرد کے ہاں اپنی ذات کی کھوج اور تلاش کا سفر شروع ہوا۔کلاسیکی شاعری میں ہمیں یہ رویہ ملتا ہے کہ جب شاعر اپنی ذات کی تلاش اور اپنی ذات کے آئینے کو جنم دیتا ہے تو وہ تصوف کے بلند مرتبے تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے اندر ڈوب کر مسرت حاصل کرتا ہے لیکن جب معاشی اور سیاسی ابتری کا شکار شاعر اپنے اندر کی دنیا میں جھانکتا ہے، اپنی ذات کو کریدتا ہے تو اسے اپنے اندر اندھیرے اور مایوسی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔معاشی توڑ پھوڑ نے اس کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔اب اس کا دل ایسے ہے جیسے کوئی کھنڈر ہو۔سیاسی اور معاشی حالات کی ابتری نے اس کی سوچوں اور تمناؤں کو کچل دیا ہے۔اس کے اندر خزاں نے ڈیرے جما لیے ہیں۔کوئی بھی خوشی اس کے دکھوں کا مداوا نہیں کر پاتی۔زخم اتنے گہرے ہیں کہ بھرنے کا نام نہیں لیتے۔

پاس ہی ڈوب رہی ہے کوئی کشتی
خود نہیں بچتے اگر اس کو بچانے لگ جائیں

(عباس تابش)

غزل نے انسانی ذات کے باطن سے خارج اور خارج سے باطن کے کئی سفر طے کیے ہیں۔ ۸۰ کی دہائی میں جو غزل سامنے آتی ہے اس میں انسان کے باطن کی تاریکی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ اس دہائی کی غزل کا اہم موضوع رہا ہے۔ انسان کی شکست اس کی ذات کی توڑ پھوڑ اس کی مایوسی اور بے چینی کا اظہار غزل کا خاص موضوع رہا ہے ۔ مارشل لا کے نفاذ کے بعد پاکستانی معاشرے میں زمین اور قومیت کا احساس تیزی سے ابھرنے لگا۔ لوگوں کے چہروں سے نقاب اترنے لگے اور اصل چہرے سامنے آنے لگے۔ مایوسی، اداسی اور بے یقینی کی دبی دبی چنگاریاں بغاوت اور غصے کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ اس رویے کی وجہ سے شاعری میں اور خصوصاً غزل میں طنز کے نشتر چلائے جانے لگے لیکن غزل کی ایمائیت اور اشاریت کو بھی قائم رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اظہار پہ پابندی تھی اور شعرا نے کھل کر اظہار خیال کرنے کے بجائے علامات کی مدد سے اپنے غم اور غصے کا اظہار کیا۔

ہر اک گھر سے بلائیں جھانکتی ہیں
عجب آسیب سا اک کو بہ کو ہے

(آصف زمان انصاری)

خامشی جرم ہے جب منہ میں زباں ہو اکبر
کچھ نہ کہنا بھی ہے ظالم کی حمایت کرنا

(اکبر حمیدی)

پرندے کل بے لباس پیڑوں سے کہہ رہے تھے
ہمیں یہ موسم بدلنے پر اختیار کتنا

(احسن زیدی)

تجھے یہ ڈر تھا کہ پائوں نہ بھیگ جائیں کہیں
گزر گئے کئی سیلاب اب تو سر سے ترے

(ارشاد ارشی)

خوف موقوف نہیں رات کی تاریکی پر
دل کبھی دن کے اجالے سے بھی ڈر جاتا ہے
(ارشد ملتانی)

یہ خاک میرے لہو کی پیاسی ہے اور شہزادؔ
یہاں میں شاخِ گلاب بونے سے رہ گیا ہوں
(قمر رضا شہزاد)

مزاحمتی ادب سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ادب محض سیاسی صورت حال کے خلاف آواز اٹھانے والا ادب ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کی قلبی واردات کے ساتھ بھی اسی درجے کا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ اس دور کی غزل میں، جو قلبی واردات کے بیان کے لیے موزوں ترین صنف ہے۔ مزاحمتی ادب کے اس پہلو کے حوالے سے ڈاکٹر انواراحمد لکھتے ہیں:

'مزاحمتی ادب' سے یہ بھی گمان ہو سکتا ہے کہ یہ حالتِ اشتعال میں لکھا جانے والا ایسا بلند آہنگ ادب ہے جو دشمن کو للکارنے، اس کے خلاف نفرت پیدا کرنے اور اپنوں کو کچوکے دینے کے کام آتا ہے۔مگر۔۔۔یہ ادب بنیادی انسانی جذبوں سے معمور اور اظہار کی ایسی سادگی سے سرشار دکھائی دیتا ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ بڑا شاعر دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے پر کس طرح قادر ہے۔۔۔گویا 'مزاحمتی ادب' کی تخلیق کے پس پردہ سیاسی و تاریخی شعور ہی نہیں، اس شعور کو وارداتِ قلبی بنانے والا تہذیبی احساس اور اجتماعی آشوب سے دردمند اور حسّاس آدمی کا بامعنی لگاؤ بھی کارفرما ہوتا ہے۔[۱۲]

اپنی زمین اور مٹی سے محبت کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔پاکستان میں ہونے والی شاعری میں یہ موضوع اس وقت سامنے آیا جب ۶۵ کی جنگ پاکستان پر مسلط ہوئی۔شعرا نے اس موضوع پر کھل کر اظہار کیا۔اپنی سرزمین کی محبت اور اس سے لگاؤ سقوط ڈھاکہ کے بعد اور بھی مضبوط ہو کر سامنے آیا اور ادب میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔اسی کا تسلسل ہمیں ۸۰ کی دہائی میں بھی ملتا ہے۔جب ارض وطن کی سا لمیت خطرے میں دکھائی دی، ملک کے محافظ ہی اسے اجاڑنے لگے تو زمین سے محبت اور وابستگی کا یہ تعلق اور بھی مضبوط ہو گیا۔اپنے ملک سے محبت کا یہ جذبہ غزلیہ شاعری کی زینت بنا۔شعرا ملکی حالات کا مقابلہ تو نہ کر سکتے تھے بس اپنی سرزمین سے محبت اور لگاؤ کے اظہار سے اپنے دکھوں کا مداوا کرتے رہے۔وہ اپنی سرزمین کو اپنی آنکھوں سے تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہے تھے۔اس سرزمین کو جسے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا۔سرزمین پاکستان کی محبت کو اپنی شاعری کا حصہ بنا کر انھوں نے یہ محبت ہر قاری کے دل میں بھر دی۔

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے
(افتخار عارف)

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ
(منیر نیازی)

بڑے خطرے میں ہے حسن گلستان ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آ گئی دیوار زنداں ہم نہ کہتے تھے
(سیف الدین سیف)

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے
(احمد فراز)

اس ملک میں بھی لوگ قیامت کے ہیں منکر
جس ملک کے ہر شہر میں اک حشر بپا ہے
(سلیم بے تاب)

بے چینی، بے چارگی، افراتفری اور اضطراب اس دور کی عام کیفیات ہیں جنھیں مختلف حوالوں سے شعرا نے تخلیقی عمل کا حصہ بنایا ہے۔

گٹھڑیاں عہدِ گزشتہ کی لیے پھرتا ہوں
اور تو بوجھ نہیں کوئی مرے شانے پر
(شہزاد احمد)

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے
(افتخار عارف)

یہ کیسی بے یقینی کی طرف لے جا رہے ہو تم ہمیں
ہمارے ساتھ کیا ہو گا ہمیں معلوم ہونا چاہیے
(ناصر بشیر)

اس دور کی شاعری نے اپنی تخلیقی ساکھ کو جس طرح برقرار رکھا ہے،اس حوالے سے ابرار احمد لکھتے ہیں:

> اس دہائی کی صورت حال میں ایک مرتبہ پھر ادیب کھلے لفظ سے ڈر گیا۔ایمائیت اور علامت نگاری کا دور ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔شاعری میں چونکہ نثری ادب کی نسبت علامتی اظہار کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لیے اس دور میں نثر کی نسبت شاعری زیادہ مقدار میں لکھی گئی۔اس دور کی تخلیقات میں ایک طرف تو حزن و ملال، افسوس، مایوسی اور جبر کی موجودگی کا دکھ نظر آتا ہے تو دوسری طرف آنے والے اچھے دنوں کی امید اور خواب دکھائی دیتے ہیں۔اس دور کا ادب احتجاج اور ردعمل کی دیگر مختلف شکلوں کی خاص حد تک مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔(۱۳)

اچھے دنوں کی امید میں جبر و تشدد کی فضا کے چھٹ جانے کی امید میں کچھ شعرا نے شعر کہنے کی طرف توجہ دی لیکن ان کی یہ امید اس وقت ٹوٹ گئی جب کراچی میں مہاجر اور غیر مہاجر کے درمیان اختلافات کو جنم دیا گیا اور سندھی، اردو کا مسئلہ پیدا ہوا۔عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے انھیں آپس میں لڑوا دیا گیا۔ہوس جب انسان کے اعصاب پر طاری ہوتی ہے تو اسے کسی کا احساس نہیں رہتا۔یہی حال پاکستان کے حکمرانوں کا تھا۔اقتدار کی ہوس نے انھیں اندھا کر دیا تھا۔انھیں اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ ملک کو تباہی کے کتنے قریب لے گئے ہیں۔

کراچی کے بگڑے ہوئے حالات اور سرعام قتل و غارت نے پورے معاشرے کو خوف اور ہراس میں مبتلا کر دیا۔یہاں ایسا لگنے لگا کہ شاید کسی بھی وقت موت آ سکتی ہے۔ایک انجانے خوف نے دل میں ڈیرا جما لیا۔غزل میں ان حالات کو اور اس تباہی و بربادی کو شعرا نے اپنا موضوع بنایا۔لیکن صرف ان حالات کا بیان کر دینا اس کا حل نہیں تھا یہ مسئلہ پاکستان کی سالمیت کے لیے بھی بہت بڑا خطرہ تھا۔کراچی کے حالات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید سنگین ہوتے گئے۔کراچی کے رہنے والے تو ان حالات سے مشکلات میں گھر گئے لیکن پورے ملک میں ان حالات سے ایک بدامنی کی فضا قائم ہو گئی۔انسانی خون اتنا سستا اور بے قیمت ہو گیا کہ آئے دن معصوم لوگوں کی جانیں ضائع ہونے لگیں۔خوف کے مارے عوام یا تو گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے یا ان انسانیت کے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ان حالات کو شعرا نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔کراچی کے ان حالات کی بھرپور عکاسی غزل میں کی گئی ہے۔ان حالات کی ترجمانی کے لیے لہو، قتل، قاتل، دھواں، اندھیرا، آندھی اور آگ جیسے الفاظ کا استعمال زیادہ کیا جانے لگا۔

ہو سکے تو کبھی تپتی شاہراہوں پر
ٹپکتے خون سے لکھی عبارتیں دیکھو

(حسن عباس رضا)

اپنی گلیوں سے امن کی خواہش
تن پہ اوڑھے دھواں گزرتی ہے

(محسن نقوی)

سوکھے ہوئے پتوں کو اڑانے کی ہوس میں
آندھی نے گرائے کئی سرسبز شجر بھی

(محسن نقوی)

صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں
قلم کی جنبشوں پر سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں

(عزیز حامد مدنی)

نکل آیا ہے سورج اور مری آنکھیں نہیں کھلتیں
میں ڈرتا ہوں نہ جانے آج کا اخبار کیا ہو گا

(شہزاد احمد)

کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

(افتخار عارف)

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

(اقبال عظیم)

وہ بھی کیا عرصۂ وحشت تھا کہ دیکھا میں نے
اپنے گھر کے درودیوار کا زنداں ہونا
واسطہ رکھتے نہیں خاک نشینوں سے کوئی
اب پیمبر نہیں قوموں پہ خدا آتے ہیں

(شہزاد احمد)

آگ کے سیلاب نے گھیرا ہے سارے شہر کو
ایک رستہ بھی نظر آتا نہیں بچتا ہوا
(جمیل یوسف)

مذکورہ حالات نے انسان کو بعض ابدی مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔اسے ایک انجانے خوف نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔حالات کی مایوسی، ناامیدی اور اداسی و غم کا رونا ایک طرف اسے ان حالات نے بھیڑ میں بھی تنہا کر دیا ہے۔یہی اس دور کے انسان کا المیہ ہے کہ اسے اپنے اور پرائے کا فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔اپنوں نے اتنے ظلم و ستم ڈھائے ہیں کہ اس کا ہر ایک سے اعتبار اٹھ گیا ہے، زندہ رہنا یا زندگی کی خواہش کرنا بے معنی لگنے لگا ہے۔زندگی کی بے ثباتی اور مصنوعی پن نے اس دہائی کے شاعر کو بھی متاثر کیا ہے۔شاعری میں بھی ہمیں ایسی ہی کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔جہاں انسان کو اتنا خوف زدہ دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہی سائے سے ڈرنے لگتا ہے اور اس میں زندہ رہنے کا احساس تک باقی نہیں رہتا۔اس صورت حال سے فرد میں ایک احساسِ مرگ پیدا ہوا ہے۔اس احساسِ مرگ کے دو پہلو ہیں۔ایک صورت وہ ہے جو فرد کو زندگی کی بے ثباتی اور اس کی بے معنویت کی طرف لے جاتی ہے۔اس سے قنوطیت پیدا ہوتی ہے۔اس دور کے شعرا کے ہاں بعض اوقات مایوسی اور بے یقینی کے سائے گہرے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

آخر کوئی کنارا اس سیل بے کراں کا
آخر کوئی مداوا اس درد زندگی کا
(مجید امجد)

کرنا پڑے گا اپنے ہی سائے میں اب قیام
چاروں طرف ہے دھوپ کا صحرا بچھا ہوا
(وزیر آغا)

وہ ہوا حالِ گلستاں کہ ہمیں
شوقِ تعمیرِ نشیمن نہ رہا
(محسن احسان)

مصروف ہم بھی انجمن آرائیوں میں تھے
گھر جل رہا تھا لوگ تماشائیوں میں تھے
(اسرار زیدی)

جنگل میں ہراساں تھے ہم روز بلاؤں سے
بستی میں بھی ہر دن ہے جنگل ہی کی ڈر تازہ
(حنیف فوق)

کوئی کھڑکی ہے سلامت نہ کوئی دروازہ
مِرے گھر کے سبھی کمرے ہیں ہوادار بہت
(صدیق افغانی)

چیخ اٹھتی ہوئی ہر گھر سے نظر آتی ہے
ہر مکاں شہر کا آسیب زدہ لگتا ہے
(عدیم ہاشمی)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اکثر اوقات شعرا نے اس احساسِ مرگ کو احساسِ زیست میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے غم کو اپنی طاقت بنایا ہے اور اس سے زندہ رہنے کا حوصلہ لیا ہے۔موت اٹل حقیقت ہے لیکن اس کی طرف جاتے ہوئے اپنی تخلیقی قوت کا بھرپور استعمال کرنے کا رویہ ان کے ہاں ابھرتا ہے۔یہاں اقبال کے ان افکار کی طرف دھیان جاتا ہے جو موت اور زندگی کے فرق کے بارے میں ہیں۔موت صرف اس انسان کے لیے ہے جس نے اپنی زندگی کسی بڑے مقصد اور آدرش کے بغیر گزاری ہے۔

زندگی کے مسائل اور زندگی کی بے ثباتی نے شاعر کو فطرت کے قریب لا کھڑا کیا ہے۔اس دور کا شاعر اپنے اردگرد وہ پاکیزگی تلاش کرتا ہے جو اسے زندگی سے محبت کرنے والا بناتی تھی۔مگر بار بار ٹوٹنے والے بھروسے اور بکھرتے ہوئے احساسات و جذبات نے شاعر کو اس دنیا سے دور ایک اور دنیا میں پہنچا دیا ہے جہاں یا تو وہ ماضی کے سہارے زندگی گزارنا پسند کرتا ہے یا زندگی کے تمام دائروں سے نکل کر اس دائرے کا حصہ بن جاتا ہے جہاں اس کو راحتیں ہی راحتیں نصیب ہوتی ہیں اور سکون ملتا ہے۔

اس دور کی غزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کسی خاص نظریے کے زیرِاثر کیفیتوں کی تکرار یا اصطلاحاتی دائروں میں مقید نہیں ہے۔اس دور کا شاعر متنوع رنگوں میں لکھتا ہے۔اس کا اپنا مزاج ہے جس پر قدیم اصطلاحیں منطبق ہوتی نظر نہیں آتیں۔خلیل الرحمن اعظمی کے لفظوں میں:

> جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے، نہ کسی ایک صفت یا کیفیت کے دائرے میں اس کو مقید کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے گذشتہ دور کے غزل گویوں کی طرح اس دور کے غزل کہنے والوں کو آپ ان اصطلاحوں کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے جیسے صوفی شاعر، رند شاعر، خمریات کا

شاعر، عشقِ حقیقی کا شاعر، عشقِ مجازی کا شاعر، ہوس ناکی اور معاملہ بندی کا شاعر، سیاسی شاعر، غمِ جاناں کا شاعر، غمِ دوراں کا شاعر، قنوطی شاعر، رجائی شاعر، زبان و محاورے کا شاعر وغیرہ کہہ کر پہلے ہم خود سمجھتے یا دوسروں کو سمجھایا کرتے تھے۔(۱۴)

۸۰ کی دہائی غزل پر مجموعی طور پر اداسی، غم، ناامیدی، مایوسی، بے چینی اور اضطراب کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔اس غزل نے سیاسی سماجی اور معاشرتی محرکات سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا جس سے غزل کے موضوعات میں وسعت آئی۔غزل میں سیاسی لب و لہجہ حاوی نظر آنے لگا۔

پاکستان کی تاریخ سیاسی بے اطمینانی اور انتشار کا شکار نظر آتی ہے۔اور اس کا ادراک و اظہار بھی اس دور میں ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوئوں پر بھی توجہ دی گئی کیونکہ محض سیاسی زاویہ کسی معاشرے کی تمام تر صورت حال کا عکاس نہیں ہو سکتا۔سیاسی حالات جب اپنا دائرۂ اثر پھیلاتے ہیں تو سماجی زندگی بھی ان سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے بعد زندگی کے دیگر پہلو بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔یہ سب پہلو رکھنے والے ادب کو ہی حقیقی معنوں میں زندگی کا عکاس اور عصری حسیت کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔

شاعری اور سیاست کا تعلق مسلّم ہے اور سیاسی حوالے سے اردو شاعری کا دامن اعلیٰ شعری تخلیقات سے بھرا ہوا ہے۔تاہم محض سیاسی موضوعات پر لکھنا شاعری کے اعلیٰ یا روحِ عصر کا ترجمان ہونے کی ضمانت نہیں۔شاعری کا تعلق شعری عناصر سے ہے۔اقبال اور فیض کی مثال ہمارے سامنے ہے جن کی شاعری کا سیاسی حوالہ بہت مضبوط ہے لیکن اس کی فضیلت اوّلاً اس کے اعلیٰ درجے کی شعری خصوصیات کی بنا پر ہے۔ بقول ظفراقبال:

کوئی بھی شاعر معاشرے سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ ہر شاعر کے اندر ایک سیاستدان بھی موجود ہوتا ہے۔تاہم یہ اس کی مرضی اور توفیق پر منحصر ہے کہ وہ سیاست کو ترجیح دے یا شاعری کو۔یعنی اس کی شاعری میں سیاست کو کتنا عمل دخل ہو گا جبکہ سیاسی شعر کہنا کسی شاعر کے لیے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں ہو سکتا، البتہ وہ اس کا خیال ضرور رکھتا ہے۔اور اگر نہیں رکھتاتو اسے رکھنا چاہیے کہ اس نسخے میں دونوں کا تناسب کیا ہو۔۔۔بسا اوقات تو غمِ جاناں اور غمِ دوراں ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں اور شاعری کا جو رُخ زیادہ روشن ہو گا اس کی شاعری اسی خانے کی زینت بنے گی۔۔۔ معاشی عدم مساوات اور ایسی دیگر آلائشوں کا احساس رکھنا اور ان پر احتجاج کرنا بے حد مستحسن بات ہے لیکن اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ کہیں توازن و تناسب میں تو گڑبڑ نہیں ہو رہی۔(۱۵)

فکر اور فن میں یہی توازن و تناسب اعلیٰ تخلیق کی پہچان ہے۔

> عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے لیکن یہ روح صرف زندگی کی یک رخی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے۔اور اسی لیے ادب کی آواز ایک طرف اپنے دور کی، اور دوسری طرف آنے والے دور کی آواز بن جاتی ہے۔ادب اور زندگی کا یہی رشتہ ہے جو واقعات سے نہیں بلکہ روح سے قائم ہوتا ہے۔[۱۶]

ادب میں سیاست کے زاویے کو سمجھے بغیر اچھی تخلیق پیدا کرنا تو شاید ممکن ہو بڑی تخلیق کے لیے سیاسی زاویہ بہرحال ایک لازمے کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیاسی شعور کا اظہار اس طرح سطحی انداز میں یا نعرے کی زبان میں کیا جائے کہ دور سے نظر آئے۔جس طرح سیاسی معاملات ہر انسان کی زندگی پر بالواسطہ طور پر اثرانداز ہوتے ہیں اسی طرح سیاست بھی بالواسطہ طور پر اس کے شعور کا حصہ ہوتی ہے۔اس کے سماجی اعمال میں بھی سیاسی اثرات اور وجوہات ایک پس پردہ محرک کے طور پر کام کرتے ہیں۔یہ کیسے ممکن ہے کہ سیاسی چیرہ دستیوں کی دھوپ میں جلتا ہوا شخص سیاسی پہلو سے کترا کر گزر جائے۔اس لیے سیاست اس دور کے تخلیق کار کا لازمی تجربہ ہے اور اس کا اثر لازمی طور پر اس کی تخلیق میں در آتا ہے۔اس عہد کی غزل کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے بنے بنائے فکری سانچوں سے جان چھڑا کر اپنا تجزیہ کرنے کی خو اپنائی ہے۔خلیل الرحمن اعظمی کے لفظوں میں:

> جدید تر شاعر کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے مقررہ نظریوں، خانوں، فارمولوں اور نعروں سے اپنا دامن چھڑایا ہے اور کسی وقت یا ہنگامی مسلک یا نصب العین سے وابستگی کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں کر پاتا۔اس نے ان لکیروں اور پُلوں کو توڑ دیا ہے اور زندگی کے ناپیداکنار سمندر میں داخل ہو گیا ہے۔وہ زندگی کی وحدت کو اپنی تمام تر وسعتوں کے ساتھ دیکھنا، برتنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔وہ نفی اور اثبات کا کوئی بنا بنایا سانچا اپنے پاس نہیں رکھتا۔وہ نہ کسی چیز کو آنکھ بند کر کے رد کرنے کے حق میں ہے اور نہ آنکھ بند کر کے قبول کرنے کی تائید میں۔بلکہ وہ خود اپنے حواس، اپنے تجربے اور اپنے ادراک سے زندگی کی ماہیئت اور حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہے۔[۱۷]

یوں اس دہائی کی غزل میں ایک متوازن اندازِ فکر نظر آتا ہے جس میں فرد کو نسبتاً زیادہ کھلے انداز میں سوچنے اور رائے قائم کرنے کی آزادی دینے کی بات کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر اس دہائی کے شاعروں کے ہاں پچھلی دو دہائیوں میں سامنے لائے گئے موضوعات اور اسالیب کو اپنانے اور انھیں زیادہ لطافت کے ساتھ بیان کرنے کے رجحانات نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ انور صابر، ڈاکٹر، ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۲۱۸

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''نئی تنقید''، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء،ص۲۸۵

۳۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، ''اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت''،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،ص۱۲۵

۴۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر،''جدید غزل میں علامت نگاری'' مشمولہ ''اردو غزل''، مرتبہ: کامل قریشی، ڈاکٹر، اردو اکادمی دہلی، ص۳۳۵

۵۔ شہزاد منظر، ''اردو افسانے کے پچاس سال''، پاکستان اسٹڈی سنٹر ،جامعہ کراچی، ص۱۵۳

۶۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، ''پاکستان میں اردو ادب سیاسی سماجی اور ادبی محرکات'' مشمولہ ''دریافت''اسلام آباد، شمارہ۸، ص۲۰۵

۷۔ خلیق انجم، پیش لفظ''اردو غزل'' ،مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۰

۸۔ شہزاد منظر، ''پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال''، ص۱۶۲

۹۔ منیر نیازی، پیش لفظ'' اردو غزل انتخاب ۱۹۷۲ تا ۷۹''، اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد، ص۱۳

۱۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر،'' پاکستانی ادب: رویے اور رجحانات''، ص۳۹

۱۱۔ خلیل الرحمن اعظمی، ''جدید تر غزل'' مطبوعہ ''فنون'' لاہور، غزل نمبر، جلد۸، شمارہ۳،۴،۱۹۶۹ء، ص۶۵

۱۲۔ انواراحمد، ڈاکٹر، ”عالمی مزاحمتی شاعری“مطبوعہ ”ماہِ نو“لاہور، فروری ۱۹۸۸ء، ص۳۴،۳۵

۱۳۔ ابرار احمد، ”مزاحمتی ادب“ مشمولہ ” مزاحمتی ادب“، مرتبہ: رشید امجد، ص۵۶

۱۴۔ خلیل الرحمن اعظمی، ”جدید تر غزل“ مطبوعہ ”فنون“ لاہور، غزل نمبر، جلد۸، شمارہ۳،۴،۱۹۶۹ء، ص۶۷

۱۵۔ ظفر اقبال، ”شاعر کون؟“ مشمولہ”ادبیات“اسلام آباد، شمارہ۹۶، جولائی تا ستمبر۲۰۱۲ء، ص۹۶،۹۷

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ”نئی تنقید“، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء،ص۲۸۴

۱۷۔ خلیل الرحمن اعظمی، ”جدید تر غزل“ مطبوعہ ”فنون“ لاہور، غزل نمبر، جلد۸، شمارہ۳،۴،۱۹۶۹ء، ص۶۵،۶۶